سہیل احمد خان ---- علامتوں کے تعاقب میں

ڈاکٹر عبدالکریم خالد، سابق صدر شعبۂ اُردو، یونیورسٹی آف ایجوکیشن، لاہور

Abstract

Suhail Ahmad Khan was a renowned critic, an accomplished scholar and a great poet. His basic work was to search out sources of symbols and access to their meanings. In this regard he sets a series of search and action and names it an unlimited journey. He has given the sages an understanding of different stages of knowledge by starting his journey. He is not among us today but his wisdom,thought and insight guide us even today.

سہیل احمد خان کو جاننے اور ماننے والوں کی کمی نہیں۔ وہ جب اس دُنیا سے رخصت ہوئے تو ایک نقاد، شاعر اور اپنے وسیع علم کی بنیاد پر ایک سکہ بند دانش وَر کے طور پر ادب میں اپنا وجود ثابت کر چکے تھے۔ ان کا اختصاص یہ ہے کہ انھوں نے علم کو معلوم کی سطح سے اٹھا کر اکتسابِ مفہوم کے درجے تک پہنچایا اور اُن طرفوں اور جہتوں تک رسائی حاصل کی جو ایک حیرت زا بصیرت کے ساتھ اُن کے قلب و ذہن پر منکشف ہوئیں اور ایک مکاشفے کا روپ اختیار کر کے اُن کے خطبات اور تحریروں میں نمایاں ہوئیں۔ اُن کا بنیادی کام علامتوں کے منابع اور اُن کی اصل تک پہنچ کر ایک نئے جہانِ علم کی دریافت ہے جس میں وہ اپنے فکر و نظر کے تمام سلسلوں اور تہذیبی رچاؤ کے ساتھ صَرف ہوئے۔ اِس عمل میں وہ ایک لامحدود سفر کا ارادہ باندھے ہوئے تھے مگر بقول انتظار حسین:

> ''افسوس کہ موت نے سفر کو کھوٹا کر دیا۔ سہیل احمد اس سفرِ شوق کو بیچ میں چھوڑ کر سفرِ آخرت پر روانہ ہو گئے'' ۔[۱]

سہیل احمد خان کے اِس لامحدود سفر کا آغاز تب ہو چکا تھا جب اُن کی عمر کے نوجوان اپنی نصابی کتابوں سے بھی واجبی سا تعلق رکھتے ہیں چہ جائیکہ وہ نصاب کے متعلقات پر بھی نظر رکھیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ جب انھوں نے ایم۔ اے میں داخلہ لیا تو اورینٹل کالج کے نامور اساتذہ میں بیشتر اُن پر اِس وجہ سے مہربان ہوئے کہ بی۔ اے تک وہ ادب کا اتنا مطالعہ کر چکے تھے جو اس سطح کے ایک عام طالب علم کی استعداد سے بہت زیادہ تھا۔ اہم کلاسیکی شعرا سے جدید شاعری اور جدید ناول اور افسانے تک متعدد کتابیں ان کی نظر سے گزر چکی تھیں۔ اورینٹل کالج میں انھوں نے اُردو ادب کے ساتھ ساتھ انگریزی ادبیات کی طرف توجہ کی اور یورپی ادب کے اہم نمائندوں کی طرف اپنے مطالعے کا رُخ پھیرا۔ سہیل احمد خان کی علم جُو شخصیت کا یہ اہم نکتہ ہے

جسے اس لیے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ آپ جو کچھ جانتے ہیں اس سے آگے جاننے کی خواہش اگر آپ کو بے چین رکھتی ہے اور آپ ماورا حقیقتوں تک پہنچنے کے لیے معلوم جہان سے جہانِ دگر کی طرف قدم مارتے ہیں تو آپ میں ضرور کوئی ایسی چیز موجود ہے جو دوسروں میں نہیں ہے۔ چناں چہ خوب سے خوب تر کی جستجو میں انھیں اپنے اساتذہ کے مبلغ علم کا بھی اندازہ ہوا۔ وہ خود لکھتے ہیں:

> ''اورینٹل کالج کے میرے مہربان اور شفیق اساتذہ نصابی مصنّفین کی حد تک تو میری رہنمائی کرتے تھے مگر اس حد سے آگے تھوڑے فاصلے تک ہی چل پاتے تھے۔'' ۲؎

جس طالب کے ذہنی تجسّس اور تیز رفتاری کا یہ عالم ہو، اس کے علمی و ادبی امکانات کے روشن تر ہونے کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ یہاں ایک سجاد باقر رضوی ہی انھیں ایسے نظر آئے جن کے ساتھ وہ کچھ دُور تک چل سکتے تھے:

> ''باقر صاحب کے لیکچر کا دبنگ انداز تھا...... پھر وہ تنقید پڑھاتے تھے۔ چنانچہ ارسطو، لان جائی نس سے کولرج، میتھیو آرنلڈ اور ٹی ایس ایلیٹ تک کے نام ان کی گفتگو میں آتے تھے۔ ژنگ اور الرخ نیومان جیسے نفسیات دانوں کے بھی وہ دلدادہ تھے۔ وہ غزل کے عمدہ شاعر بھی تھے اور طلبہ کے تخلیقی رجحانات کی حوصلہ افزائی بھی بہت کرتے تھے...... باقر صاحب اگر اس وقت میرے اساتذہ میں نہ ہوتے تو میرے مطالعے کے لیے نئی راہیں شاید کچھ دیر بعد کھلتیں'' ۳؎

سجاد باقر رضوی کی قربت میں رہ کر وہ ان کی علمی و ادبی صحبتوں سے فیض یاب ہوئے۔ مگر کچھ اور وسعت کی تلاش نے انھیں اِس مقام سے بھی آگے بڑھنے پر اُکسایا۔ اُن کا خیال تھا کہ باقر صاحب کے ادبی نظام کو سمجھ کر وہ اس سے جو اخذ کر سکتے تھے، اپنی صلاحیت کے مطابق وہ اخذ کر چکے ہیں لہٰذا اَب اِس مقام سے گزرنا ضروری ہے۔

> ''اصل میں باقر صاحب افکار کی تفہیم اور ان پر بحث کے آدمی تھے۔ جدید عالمی ادب کا اُن کا مطالعہ اتنا وسیع نہ تھا۔ ناول اور افسانے سے انھیں بہت کم دلچسپی تھی۔ اُردو شاعری میں غزل اور مرثیے کے علاوہ دیگر اصناف سے لگاؤ کم تھا۔ ان کی کلاسیکیت، جو ان کے رومانی مزاج پر نافذ کردہ تھی، میرے لیے زیادہ کشش نہیں رکھتی تھی۔ بہرحال وہ مرحلہ آیا جہاں باقر صاحب کے تمام تر احترام اور ان کے ساتھ رفاقت کے گہرے احساس کے باوجود مجھے احساس ہونے لگا کہ باقر صاحب مجھے جہاں تک لے آئے ہیں اس سے آگے کے مراحل کے لیے وہ رہنما نہیں بن سکیں گے'' ۔۴؎

سہیل احمد خان کے سفر میں سجاد باقر رضوی ایک پڑاؤ ثابت ہوئے وہ اپنی دُھن میں آگے بڑھتے رہے۔ اِس بارے میں کئی ایک روایتیں ہیں۔ بقول احمد جاوید:

> ''ہم سے قبل ڈاکٹر سہیل احمد خان ان کے پسندیدہ شاگرد رہ چکے تھے اور اَب کسی اور کی باری تھی'' ۔۵؎

ہمارے بعض احباب جو ''یک گیر و محکم گیر'' کے قائل ہیں۔ انھیں یہ بات ناگوار گزرتی ہے کہ سہیل احمد خان، سجاد باقر رضوی کے دائرے سے کیوں باہر نکلے؟ جب کہ ان کا سارا کیریئر باقر صاحب ہی کے ہاتھوں بنا تھا۔ اس سلسلے میں دونوں کے مابین اختلافات کی نشان دہی بھی کی جاتی ہے۔ اگر تو یہ اختلافات علمی نوعیت کے تھے تو یہ صحت مندی کی علامت تھے۔ اور اِس

نوع کے اختلافات باقر صاحب کے اپنے دوسرے صاحبِ علم شاگردوں کے ساتھ بھی رہے اور باقر صاحب بڑی حوصلہ مندی کے ساتھ اِن اختلافات کو سُنتے تھے۔ ڈاکٹر تبسّم کاشمیری لکھتے ہیں:

''ان کے اندر فریقِ مخالف کی بات کو سننے کا بڑا حوصلہ تھا۔ باقر صاحب کا مزاج کلاسیکی تھا۔ وہ جدیدیت کو ایک حد تک ہی مانتے تھے۔ سرسیّد تحریک کے نقاد تھے اور اکبر کے پرستار۔ جب کہ ہم جدیدیت کی طرف مائل تھے۔ اکبر اور ان کی روایت کو جاگیرداری زوال کی باقیات قرار دیتے تھے۔ باقر صاحب ہر بار تہذیب اور اس کی جڑوں کی بات کرتے تھے۔ ماضی کی میراث ان کو عزیز تھی۔ اس حوالے سے وہ غزل کے شاعر تھے۔ جب کہ ہم لوگ نئی شاعری کے ثناخواں تھے۔ ان کے Thesis کا کوئی بھی حصہ ہمارے لیے قابلِ قبول نہ تھا۔ اس کے لیے حقیقتاً بڑا کلیجہ چاہیے کہ استاد طلبہ سے اپنی بات نہ منوا سکے اور اُلٹا ان کی مخالفانہ آرا کو توجہ سے سُنے''۔۶

چناں چہ یہ معاملہ صرف سہیل احمد خان کے ساتھ ہی مخصوص نہیں تھا۔ باقر صاحب کے بعض دیگر شاگردوں کے ساتھ بھی اُن کی مخالفانہ بحثیں چلتی تھیں اور بقول ڈاکٹر تبسّم کاشمیری: ''وہ اپنے طلبہ کی انفرادی آزادی اور سوچ کا احترام کرتے تھے اور ان کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ طالب علم اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے اپنا نقطۂ نظر خود بنائے۔''۷

یہ درست ہے کہ سہیل احمد خان نے اس آزادی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے باقر صاحب سے الگ اپنی راہ متعیّن کی تاہم اس میں ان کی حقیقت پسندی کو زیادہ داخل ہے۔ وہ اگر نِری جذباتیت کے قائل ہوتے تو باقر صاحب کو حرفِ آخر سمجھ کر اِسی دَر کے اسیر رہتے اور باقر صاحب کے حلقۂ اثر سے نکل کر انھوں نے جدید عالمی ادب کے جو مطالعے کیے ہیں، ان سے وہ محروم رہ جاتے اور مظفر علی سیّد۸ ان کے شعور کی دنیا میں دَر نہ آتے اور ان کی ادبی معلومات ان کے لیے حیرت انگیز ثابت نہ ہوتیں:

''مجھے فوراً اندازہ ہو چکا تھا کہ مظفر صاحب کی ادبی معلومات حیرت انگیز ہیں۔ یورپی ادب ہو یا عربی فارسی کا ادب، اُردو ادب ہو یا ہندی ادب، ان کے مطالعے کی وسعت اس وقت میرے لیے حیرانی ہی حیرانی تھی۔ ان کی بعض آرا اور ادبی ترجیحات میرے مزاج سے مختلف تھیں اور میں ہمیشہ ان کی بات نہیں مانتا تھا مگر یہ حیرت اپنی جگہ تھی''۔۹

''سیّد صاحب کے مطالعے کی وسعت کا کیا بیان ہو۔ ادب سے معاشیات، معاشیات سے نفسیات حتیٰ کہ جنگی علوم تک ان کا علم دریاؤ تھا۔ خود ادب میں لغت سے عروض اور عروض سے گرامر تک ہر شعبہ ان کی دسترس میں تھا''۔۱۰

''ایسے کئی ''محققین'' اور ''نقادوں'' کو بھی میں جانتا ہوں جو اَب سیّد صاحب کے علمی احسانات کو تسلیم نہیں کریں گے لیکن ان کی تحقیق جو برسوں بعد شائع ہوئی، سیّد صاحب کی فراہم کردہ ان معلومات کا عکس تھا جو ہم سیّد صاحب سے برسوں پہلے سُن چکے تھے''۔۱۱

سہیل احمد خان کے یہ اعترافات ان کے مضمون ''مظفر علی سیّد'' میں موجود ہیں جو انھوں نے مظفر علی سیّد کے انتقال کے بعد لکھا اور ان کی کتاب ''سیر بین'' میں شامل ہے۔ اِس مضمون میں انھوں نے مظفر علی سیّد کو اپنی زندگی، اپنے ذہن اور اپنی

ادبی شخصیت میں تلاش کیا ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ انھوں نے ان کے علم سے بہت فائدہ اٹھایا ہے۔ مولانا روم سے لے کر بیدل، میرا بائی سے میر اور ایلیٹ سے والس سٹیونز تک مختلف زبانوں کے بہت سے ایسے شعراء کی زبانی سُنے جنھیں خود پڑھنے کا اتفاق بعد میں ہوا۔ مظہریاتی تنقید کے امام ژور ژپولے کا ذکر لاہور کے ادبی حلقوں میں سب سے پہلے سیّد صاحب ہی سے سُنا۔ جدید ایرانی شاعر مہدی اخوان ثالث کی فارسی نظم ''قصہ شہر سنگستان'' پڑھنے میں مشکل پیش آئی تو سیّد صاحب نے ہر سطر کا ترجمہ کر کے یہ نظم انھیں پڑھائی۔ ایرانی ناقد رضا براہنی کی تنقید کی اہمیت سیّد صاحب کی گفتگو اور ان کی فراہم کردہ کتب کے مطالعے سے ہی واضح ہوئی۔ یوں لگتا ہے کہ مظفر علی سیّد کی ادبی رفاقت نے علوم کے کئی دروازے ان پر کھولے اور وہ اُردو ادب و شاعری کے کئی گوشوں سمیت مختلف زبانوں کے ادب سے سیّد صاحب کے توسّط ہی سے آشنا ہوئے۔[۱۲]

میرے خیال میں یہ سہیل احمد خان کا ظرف ہے کہ انھوں نے اپنے اکتسابی عمل کے اِس پہلو کو بھی صاف گوئی سے بیان کر دیا کہ وہ کن کن لوگوں کے ساتھ کہاں تک چلے اور کن لوگوں کی رفاقت نے اُن کے ذہنی اُفق کو روشن کرنے میں مدد دی۔ آج کے زمانے میں جبکہ دوسروں کے خیالات اور جملے تک اُچک کر اپنے نام لگانے اور جعل سازی پر پردہ ڈال کر اپنی نام نہاد علمیّت جتانے کا چلن عام ہے، ایسے لوگ کہاں ہوتے ہیں؟ علم ہمیشہ سچ کی کوکھ سے برآمد ہوتا ہے اور علم کی پہچان یہ ہے کہ وہ سچے آدمی کے ذہن میں سماتا ہے۔ یہ قول کتنی بڑی صداقت کا مظہر ہے کہ عالم کا علم اس کے عجز میں نہاں ہوتا ہے۔ عجز بہت بڑی سچائی ہے جو صاحب قال کو خاموش رہنا سکھاتی ہے۔ صوفیا کے نزدیک خاموشی، روح کو بیدار رکھنے کا ایک زینہ ہے۔ سہیل احمد خان کبھی کبھی مجھے اِسی زینے پر کھڑے نظر آتے ہیں۔ ان کی کم گوئی، علم جوئی کو مہمیز دیتی اور لامحدود کے سفر کو ہموار کرتی دکھائی دیتی ہے۔

سہیل احمد خان کا علمی و ادبی آموختہ ان کی سات نثری کتابوں میں محفوظ ہے۔ (سات کے عدد کی اپنی ایک معنویت ہے) اور یہ سات کتابیں ایک وحدت میں سمٹ کر مجموعہ کی صورت میں دستیاب ہیں۔ ہمارا موضوع چونکہ ان کی علامت فہمی اور اس کی تعبیر و تشریح تک محدود ہے، لہٰذا ان کی تحریروں کے وہی حصے زیرِ بحث آئیں گے جن میں اس موضوع کے بارے میں اُنھوں نے اپنے خیالات پیش کیے ہیں۔ ان کی پہلی نثری کتاب ''علامتوں کے سرچشمے'' ۱۹۰۰ء میں منظرِ عام پر آئی۔ اس کتاب میں شامل مضامین واحد موضوع ''علامت'' کے پس منظر اور اس کی مختلف جہتوں کی عقدہ کشائی کرتے ہیں۔ سہیل احمد خان کو علامت کے مسئلے سے خاص دلچسپی رہی ہے۔ ستر کی دہائی کے آس پاس وہ علامتوں کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کی تفہیم و تشریح کے ضمن میں انھوں نے عالمی ادب کا معتدبہ حصہ کھنگال ڈالا۔ اِس بارے میں وہ لکھتے ہیں:

> ''یہ سفر علامتوں کی تفہیم اور علامتی اظہار کی کھوج سے شروع ہوا۔ خود شاعروں اور نقادوں کے مضامین میں نفسیات اور دوسرے علوم کے جو حوالے آئے وہ اس کھوج میں رہنما بنے اور اِس مسئلے کو سمجھنے کے لیے ان علوم کی شاہراہوں کی طرف لے گئے۔ بعد میں داستانوں کے رموز پر کام کرتے ہوئے یہ شاہراہیں قدیم تہذیبوں کی پراسرار کائنات کی طرف مڑتی گئیں''۔[۱۳]

سہیل احمد خان علامتوں کے مافیہ کی تلاش کے عمل کو ایک طویل سفر کا آغاز قرار دیتے ہیں۔ اُن کے نزدیک علامتوں کے سرچشمے لامحدود ہیں جن تک پہنچنے کے لیے سفر در سفر کی کیفیت درکار ہے۔ انھوں نے علامتوں کی تفہیم کے لیے نئے علوم کی

طرف رجوع کیا۔ اور جب نئے علوم کی اتھاہ میں اترے تو قدیم تہذیبوں کا سراغ ملا کیونکہ نئے علوم کے نمائندے اپنے نتائج کے لیے انہی تہذیبوں کی طرف دیکھتے ہیں۔ یوں وہ ان تہذیبوں کی اتھاہ تک پہنچنے کے لیے کہیں نئے علوم کے نمائندوں کے شریک سفر رہے اور کہیں ان تہذیبوں کے بکھرے ہوئے اجزا چُننے کے لیے الگ سے کئی راستوں پر چلے۔ یہ دراصل ایک مکاشفاتی سفر تھا جس میں ان کی اپنی ذات بھی برابر کی شریک تھی۔ چناں چہ جب وہ یہ بات کہتے ہیں کہ: ''ہوسکتا ہے کہ میری اپنی ذات کی کسی نفسیاتی ضرورت ہی نے مجھے اس طرف مائل کیا ہو۔'' یا ''اس سفر سے میری اپنی ذات کو کیا ملا، اس سے دوسروں کو شاید دلچسپی نہ ہو۔'' ۱۴ تو اس مکاشفے کی رمز سمجھ میں آتی ہے۔

> ''صرف علامتوں تک پہنچ جانا بھی کافی نہیں۔ جب تک انسان ان علامتوں کو اپنے وجود میں زندہ نہ کرے اور ان کے ذریعے فطرت اور اپنے رویا میں ایک اشتراک نہ ڈھونڈ سکے، بات نہیں بنتی''۔ ۱۵

یہاں وہ انگریزی شاعرہ اور نقاد کیتھلین رین کے حوالے سے یہ اہم بات کہتے ہیں کہ صحیح معنوں میں ایک وژنری (Visionary) یعنی صاحب بصیرت اور دیدہ ور ہی علامتی ادیب ہوسکتا ہے۔ چاہے یہ علامتیں اسے خواب کے راستے سے ملیں، دن سپنوں میں ملیں یا مراقبے کی کیفیت میں۔ سہیل احمد خان اس میں شعوری طور پر روایتی دستاویزوں کے مطالعے کو بھی شامل کر کے کیتھلین رین کی اس بات پر صاد کرتے ہیں کہ یہ علامتیں عام طور پر فطرت کی اشیا میں ظاہر ہوتی ہیں مگر اس ظاہر کو باطنی جوہر سے ہم آہنگ بھی کرتی ہیں۔ چناں چہ بعض علامتیں کسی خاص شاعر یا مصوّر کے باطن میں خاص طرح زندہ رہتی ہیں۔ مثلاً شاعر یا مصوّر یوں تو بہت سی علامتیں استعمال کرتے ہیں لیکن کوئی خاص علامتی موضوع اپنے متعلّقات کے ہالے سمیت ان کے رویا پر مستقل چھائے رہتے ہیں۔ کیتھلین رین نے اِس سلسلے میں ملٹن، شیلے، ییٹس اور خود اپنی مثال پیش کی ہے کہ کس طرح بعض مخصوص علامتیں مستقل طور پر ان کے رویا پر سایہ فگن رہیں۔ سہیل احمد خان اُردو شعر وادب میں انتظار حسین، ناصر کاظمی، منیر نیازی، جیلانی کامران اور صلاح الدین محمود کی مثال پیش کرتے ہیں۔ انتظار حسین کے ہاں ''بستی'' اور ''بستی سے ہجرت'' مستقل موضوع ہے۔ اسی طرح ''تبدیلی قالب'' کا رویا بھی کچھ عرصہ ان پر غالب رہا۔ ناصر کاظمی ''قافلے'' اور ''سنسان شہر'' کی گرفت میں رہے۔ منیر نیازی ''آسیبی بستی'' اور ''عذاب کی زد میں آئے ہوئے شہر'' کے رویا میں رہے۔ جیلانی کامران کی شاعری میں ''ازلی یا کائناتی عورت'' کا رویا ہے۔ صلاح الدین محمود کی شاعری میں ''کھوئے ہوئے بچپن'' کا رویا دکھائی دیتا ہے۔ تاہم بقول سہیل احمد خان: ''دیکھنے کی اصل چیز تو یہ ہوگی کہ کوئی فن کار اپنے اس رویا کو کس حد تک وسعت دے گا اور کس پیرائے میں بیان کر سکا۔'' ۱۶

علامتوں کی تشریح کے سوال پر سہیل احمد خان کا موقف یہ ہے کہ اس کے لیے ایک کُل کا تصور ضروری ہے جس کی اساس پر جزو میں کُل دیکھا جا سکتا ہے۔ علامت یعنی ''سمبل'' کے اصل مفہوم (کسی چیز کا ٹکڑا جسے جب دوسرے ٹکڑے کے ساتھ رکھا جائے یا ملایا جائے تو وہ اس مفہوم کو زندہ کر دے یا یاد دلا دے جس کا وہ شناختی نشان ہے) کی بنیاد پر ایڈورڈ ایف ایڈنگر کہتے ہیں، یہ معانی علامت کے نفسیاتی معنوں کے بھی بہت قریب ہیں کیونکہ علامتیں ہماری اصل وحدت سے ہمارا رشتہ جوڑ دیتی ہیں اور تضادات کو ختم کر کے وحدت کو حاصل کرنے میں مدد دیتی ہیں۔ سہیل احمد خان ایڈنگر کی اس بات سے انکار نہیں کرتے تاہم اُن کے یہاں مابعدالطبیعیاتی فکر کُل کے تصوّر کو مرتّب صورت میں پیش کرتی ہے اور علامتوں کا رشتہ ان بالاتر حقائق سے جوڑ

دیتی ہے جو نفسیاتی وحدت سے کہیں اوپر روحانی وحدت کی طرف لے جاتے ہیں۔ اُن کے خیال میں نئے علوم بھی، جن میں خالص سائنسی علوم بھی شامل ہیں، کسی نہ کسی انداز میں وحدت کو حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ۱۷

کتاب کے دوسرے مضمون ''علامتی کائنات'' میں علامت کی مرکزی اور بنیادی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کی گئی ہے اور مغربی نقادوں کے نظریات کی روشنی میں نفسیاتی، فلسفیانہ اور مابعدالطبیعیاتی تناظر میں اس مسئلے کی مختلف جہتوں کی وضاحت ملتی ہے۔ مضمون ''وجود کا شجر'' میں سہیل احمد خان نے ''شجر'' کو ان قدیم علامتوں میں شمار کیا ہے جو انسانی صورت حال کو آفاقی زبان میں پیش کرتی ہیں اور اپنی اعلیٰ ترین سطح پر مابعدالطبیعیات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک اس علامت کی بے شمار سماجی، تہذیبی، مذہبی اور مابعدالطبیعیاتی معنویتیں ہیں جو کئی سطحوں پر ظاہر ہوتی ہیں۔

اُن کے مطابق ''شجر'' وحدت میں کثرت کو دکھانے کے لیے بڑی موزوں علامت ہے۔ اس کا پھیلاؤ، جڑوں سے پھوٹ کر دُور تک اونچا ہو جانا، اس کی شاخیں، پتّے، پھل عالمِ کثرت کی تمثیلی تصویر بھی ہیں اور وحدت کا نمونہ بھی۔ بیج کی وحدت شجر کے تنے، شاخوں، پتوں اور پھلوں کی کثرت میں ڈھل جاتی ہے۔ اِسی طرح وجود کی وحدت کثرت کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ ہر چیز وحدت سے پھوٹتی ہے اور وحدت کی طرف لوٹتی ہے۔ سہیل احمد خان قدیم چینی رمزیت کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ وہاں ایسے شجر بھی ملتے ہیں جن کی شاخوں کے آخری سرے دو دو ہو کر ملتے چلے جاتے ہیں۔ اِسی طرح بعض اوقات ایک ہی جڑ سے دو شجر پھوٹتے دکھائے گئے ہیں۔ جن کی شاخیں ملی ہوئی ہیں یا دو شجر جو ایک دوسرے سے فاصلے پر ہوتے ہیں اور ایک شاخ کے ذریعے ایک دوسرے سے ملے ہوتے ہیں اور اس مشترکہ شاخ سے ایک چھوٹی شاخ پھوٹتی دکھائی جاتی ہے۔ گویا شجر کے ذریعے کائناتی ظہور کی مختلف شکلوں کو یا وجود کی وحدت کو دکھایا گیا ہے۔ جس طرح شجر خارجی کائنات کو ظاہر کرتا ہے اسی طرح وہ انسانی وجود کی باطنی وحدت کی تصویر بھی بن جاتا ہے۔ عیسوی روایت میں بھی اس علامت کا بنیادی کردار ہے۔ صلیب لکڑی سے بنائی گئی اور لکڑی شجر ہی کی ایک شکل ہے۔ پھر صلیب عیسوی روایت میں کائناتی شجر کی علامت بھی ہے جو پوری کائنات کا مظہر ہے۔ ''شجر'' کی اِس معنویت کو سمجھنے کے لیے انھوں نے رینے گینوں کی کتاب "Symbolism of Cross" سے استفادہ کیا ہے اور اِس استفادے کی مختلف صورتیں انہوں نے اس مضمون میں پیش کی ہیں۔ اسلامی تہذیب میں بھی شجر کی علامت ایک خاص معنویت کی حامل ہے۔ قرآن مجید میں کئی جگہ شجر کی مثال آئی ہے۔ سورۃ ابراہیم کی آیت ۲۵، ۲۶، ۲۷ میں پاک کلام کی مثال شجرہ طیبہ سے دی گئی ہے جس کی جڑ مضبوطی سے قائم ہوتی ہے اور اس کی شاخ آسمان کی بلندی میں ہے یہ درخت ہر وقت اپنے ربّ کے اذن سے اپنا پھل دیتا ہے۔ اِسی طرح بُرے کلام کی مثال شجرہ خبیثہ سے دی گئی ہے جسے زمین سے اُکھاڑ دیا گیا ہو اور جسے قرار نہ ہو۔ سورہ بنی اسرائیل میں شجرہ ملعونہ اور سورۃ الدخان اور الصٰفٰت میں شجرۃ الزقوم کا ذکر ہے جو ایک ملعون قوم اور عذاب جہنم کے ساتھ منسلک ہے۔ سورۃ النور میں اللہ تعالیٰ نے اپنے نور کے حوالے سے ایک برکت والے درخت کا ذکر کیا ہے۔ یہ تمام اذکار سہیل احمد خان کے مضمون میں موجود ہیں اور اِن کے حوالے سے انھوں نے شجر کی علامت کو اسلامی تہذیب کے بنیادی عقائد سے مربوط کیا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ابن العربی کے رسالہ ''شجرۃ الکون'' کا حوالہ بھی دیا ہے جس میں شجر کی مختلف معنوی صورتوں کو ایک عظیم مابعدالطبیعیاتی وحدت میں پرویا گیا ہے۔ ۱۸

سہیل احمد خان نے صوفیانہ فکر کے حوالے سے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے ''یازدہ رسائل'' بالخصوص رسالہ

''وجودالعاشقین'' سے شجر کی علامت کی جو تشریح نقل کی ہے وہ فکر و نظر کے نئے در وا کرتی ہے۔ اِسی طرح اُردو کی کلاسیکی شاعری، مثنویوں، داستانوں اور دیگر اصناف میں اِس علامت کے مختلف سطحوں پر استعمال کو بھی انھوں نے اپنے مطالعے میں شامل کیا ہے۔ داستانوں پر تحقیقی کام کرتے ہوئے انھوں نے جہاں دیگر داستانوی علامتوں کو دریافت کیا وہاں شجر کی علامت کی بھی نشان دہی کی ہے۔ بطور خاص آرائش محفل میں حاتم کے چوتھے سفر میں ایک عظیم شجر ظاہر ہوتا ہے جس کی ہر ڈالی میں آدمیوں کے سر لٹکتے ہیں۔ ایک مرحلے پر حاتم کا اپنا سر بھی ان سروں کے ساتھ اس شجر پر لٹکتا دکھایا گیا ہے۔

سہیل احمد خان نے ''داستانوں کا علامتی مطالعہ'' کے موضوع پر اپنا پی ایچ۔ ڈی کا مقالہ لکھا۔ جس پر ۱۹۷۹ء میں انھیں پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی گئی۔ بعد میں انھوں نے اِس مقالے کے چند ابواب جو براہ راست علامتوں کی تعبیر و تشریح سے متعلق تھے ''داستانوں کی علامتی کائنات'' کے عنوان سے کتابی صورت میں شائع کرائے۔ یہ کتاب ۱۹۷۹ء میں منظر عام پر آئی اور اس سے داستانوں کی ایک نئی جہت اپنے پورے معنوی سیاق و سباق کے ساتھ سامنے آئی جو اِس سے پہلے نقادوں کے دائرہ فہم میں نہیں تھی۔ سہیل احمد خان نے داستانوں کو عام روایتی انداز میں دیکھنے کے بجائے ان کی تمثیلی، استعاراتی یا علامتی سطحوں کا ادراک کر کے ان کی رمزیت کو دریافت کیا اور نتائج کے اعتبار سے انھیں حکمت اور تربیت نفس سے مربوط کیا۔ ہیرو کے باب میں ہر داستان کا ہیرو علامت کے طور پر اپنی ایک معنویت رکھتا ہے تاہم ان کے نزدیک حاتم چونکہ مکمل ہیرو ہے اور اسے ہماری تہذیب میں قبول کیا گیا ہے لہٰذا اسے ایک نمائندہ کردار کے طور پر چُنا جا سکتا ہے۔ حاتم کی مہمات جو اس کے سات سفروں کو محیط ہیں دراصل اس کی صلاحیتوں کی آزمائش اور اپنے نفس اور باطن کی اصلاح کے مختلف مدارج ہیں جنھیں تصوّف کی اصطلاح میں سلوک کی سات وادیاں کہا گیا ہے۔ سہیل احمد خان نے حاتم کے اِن اسفار اور تصوّف کے مابعدالطبیعیاتی نظام کے سات مراحل میں حیرت انگیز مشابہت تلاش کی ہے جسے سلسلہ وار سفروں کے دوران میں پیش آنے والے واقعات اور اُبھرنے والی علامتوں کے آئینے میں یوں سمجھا جا سکتا ہے:

۱۔ پہلا سفر اس سوال کا جواب حاصل کرنے کے لیے اختیار کیا گیا کہ ''ایک بار دیکھا ہے دوسری دفعہ کی ہوس ہے۔'' سہیل احمد خان کے نزدیک، یہ تربیت نفس کا ابتدائی مرحلہ ہے جو ''سلوک'' کی مناسب تیاری کے ضمن میں آتا ہے۔ حاتم اس سوال کا جواب لانے کے لیے جو سفر اختیار کرتا ہے اس میں جانوروں کا بار بار سامنے آنا نفس کے حیوانی درجے کی نشان دہی کرتا ہے۔ اس میں اسے اپنے نفس کے رذائل کی پہچان ہوتی ہے اور یہ ادراک حاصل ہوتا ہے کہ وجود کے پست عناصر کو ختم کرنا مشکل ہے مگر ان کا رُخ مثبت سطح کی طرف موڑا جا سکتا ہے۔ ۱۹

۲۔ دوسرا سفر اس سوال کے جواب کی تلاش کا ہے کہ اس آواز کا بھید معلوم کیا جائے کہ ''وہ کام نہ کیا میں نے جو آج کی رات میرے کام آتا۔'' سہیل احمد خان کے نزدیک یہ معرفت کی دوسری منزل ہے اور وجود کی مزید تطہیر کا مرحلہ ہے۔ اس سفر میں حاتم نو ہاتھ، نو پاؤں اور نو منہ والی ایک بلا کو ہلاک کرنے کے لیے دو سو گز لمبا آئینہ تیار کراتا ہے۔ بلا خود کو آئینے میں دیکھتی ہے تو غصّے سے اس کا پیٹ پھول جاتا ہے اور بالآخر پھٹ جاتا ہے اور اس کے شکم کی آلائشیں جنگل میں بکھر جاتی ہیں۔ کیا ہماری مسخ شدہ اَنا اسی طرح

پُھولی نہیں ہوتی؟ کبر اور خود پسندی کو آئینہ دکھا دیا جائے تو وہ اپنی صورت کی تاب نہ لاسکیں گے؟ تزکیہ نفس کی کچھ اور صورتیں بھی اس سفر میں آتی ہیں۔۲۰

۳۔ تیسرا سفر اس بات کی خبر میں ہے کہ ''کسی سے بدی نہ کر، اگر کرے گا تو وہی تیرے آگے آوے گی۔'' اس سفر میں حاتم آٹھ پاؤں اور سات سر والے ایک جانور کو ہلاک کرتا ہے۔ حاتم اس کے مختلف بہروپ دیکھتا ہے اور فنا کا نظارہ کرتا ہے۔ ملک الموت حاتم کو بتاتا ہے کہ ابھی اس کی آدھی عمر باقی ہے۔۲۱

۴۔ چوتھے سفر میں ''سچ کو ہمیشہ راحت ہے'' کا بھید معلوم کرنا ہے۔ سہیل احمد خان کے خیال میں یہ سلوک کے مراحل کے اعتبار سے استغنا کی وادی ہے۔ یہاں حاتم کو وہ درخت نظر آتا ہے جس کی ہر ڈالی میں آدمیوں کے سر لٹکتے ہیں۔ شجر کی علامت بہت پیچیدہ اور کثیر الجہت ہے۔ نمو اور افزائش کے ظاہری مفہوم سے لے کر مذہبی روایات کے عظیم کائناتی شجر کے پورے وجود کے دائرے کو محیط ہونے تک اس کے بے شمار مدارج ہیں۔ انسان کے اعمال و افعال کو بھی درخت کے پھل کہا جاتا ہے۔ اسی سفر میں حاتم کو خواجہ خضرؑ بھی ملتے ہیں چناں چہ تائید غیبی کا داستانی ''موتیف'' سامنے آتا ہے۔ خواجہ خضرؑ حاتم کو اسم اعظم بتلاتے ہیں جس سے وہ جادو کا توڑ کرتا ہے۔ اَب گویا حاتم کا وجود کی اعلیٰ تر سطحوں سے رابطہ استوار ہو چکا ہے۔۲۲

۵۔ حاتم کا پانچواں سفر ''کوہِ ندا'' کا سفر ہے۔ سہیل احمد خان کے نزدیک کوہِ ندا کی رمزیت بڑی معنی خیز ہے۔ اس سفر میں حاتم جگہ جگہ موت سے متعلق عجیب و غریب رسمیں دیکھتا ہے۔ کوہِ ندا، فنا کی رمز ہے یا تصوّف کے حوالے سے ''فنائے اصطلاحی'' کی علامت ہے اور مرنے سے پہلے مر جانے کی حقیقت کا بیان ہے۔ کوہِ ندا تک پہنچنے کے بعد واپسی کے سفر میں وہ لہو کا دریا دیکھتا ہے، لہو روایتی حکمت میں عموماً غفلت کی علامت ہے۔ پھر ایک ایسا دریا آتا ہے جس میں ہاتھ ڈالنے سے ہاتھ چاندی کا ہو جاتا ہے۔ پھر ایک سونے کی رنگت والے پانی کا دریا ہے جہاں ہزاروں موتی سنگ ریزوں کی طرح پڑے دکھائی دیتے ہیں۔ پھر سونے کا پہاڑ، سونے کا میدان آتا ہے۔ پھر ایک باغ آتا ہے جہاں سونے کے درخت ہیں۔ پھر ایک سونے کے دریا کا سامنا ہے۔ پھر ایک آگ کے دریا سے گزر ہوتا ہے۔ سہیل احمد خان کے نزدیک یہ سیر نزولی بے حد معنی خیز ہے۔ اَب وجود کے کم تر عناصر بیش قیمت بن چکے ہیں۔ فیوض و برکات اور انوار کی بارش ہو رہی ہے۔ دریا کا بھید بھی بہت گہرا ہے۔ یہ وحدت کی بھی علامت ہے، عالم حادث کی بھی، معرفت کی بھی۔ دریا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے پر جانا ایک کیفیت سے دوسری کیفیت میں جانا بھی ہے۔ سونے اور چاندی کے دریا اعلیٰ روحانی یا نفسیاتی سطحوں تک اُٹھ جانے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔۲۳

۶۔ حاتم کا چھٹا سفر ''مرغابی کے انڈے کے برابر موتی'' لانے کے لیے ہے۔ سہیل احمد خان کے نزدیک انڈے کی علامت بالعموم وحدت کی نشان دہی کرتی ہے اور موتی معرفت کا راز بھی ہوسکتا ہے۔۲۴

۷۔ حاتم کا ساتواں سفر ''حمام بادگرد'' کا راز معلوم کرنے کا سفر ہے۔ سہیل احمد خان کے نزدیک حاتم کی یہ مہم بہت معنی خیز ہے کیونکہ یہ سلوک کا آخری مرحلہ ہے۔ حمام بادگر تطہیر یا تزکیہ نفس کی علامت ہے۔ اور یہ فنا کی منزل سے پہلے تطہیر کی رمز ہے۔ حمام میں داخل ہو کر حاتم تین مرتبہ پانی سر پر ڈالتا ہے۔ تیسری مرتبہ پانی سر پر ڈالنے سے اندھیرا ہو جاتا ہے۔ تاریکی ختم ہوتی ہے تو حاتم خود کو ایک گنبد میں پاتا ہے جہاں ہر طرف پانی ہی پانی ہے۔ پانی عالم حادث کی علامت بھی ہے۔ گنبد سے نکل کر وہ ایک جنگل میں پہنچتا ہے جہاں اسے ایک عالی شان عمارت نظر آتی ہے۔ یہاں ایک طوطی پنجرے میں ہے اور ایوان پر عبارت لکھی ہے کہ یہ طلسم ہے اگر کوئی اس سے باہر نکلنا چاہتا ہے تو تیر کمان اٹھا کر طوطی کے سر میں تیر مارے۔ اگر طوطی کے سر میں تیر لگا تو وہ طلسم سے باہر ہوگا اور ایک نایاب ہیرا بھی حاصل کرے گا اگر تیر طوطی کے نہ لگا تو وہ پتھر کا ہو جائے گا۔ حاتم تیر چلاتا ہے لیکن نشانہ چُوک جاتا ہے اور وہ گھٹنوں تک پتھر کا ہو جاتا ہے اور سو قدم پیچھے جا گرتا ہے۔ دوسری مرتبہ پھر نشانہ چوکتا ہے۔ حاتم ناف تک پتھر کا ہو جاتا ہے اور دو سو قدم پیچھے جا گرتا ہے۔ وہ زار زار روتا ہے لیکن اللہ پر توکّل کر کے تیسرا تیر مارتا ہے جو طوطی کے لگتا ہے اور وہ پتھر سے باہر گر جاتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی آندھی آتی ہے اور طلسم کی تاثیر ختم ہو جاتی ہے۔ سہیل احمد خان اس سارے عمل کی یوں وضاحت کرتے ہیں کہ یہ سفر فنا اور بقا کے مراحل سے وابستہ ہے۔ فنا حاصل کرنا سلوک کا اصل مقصد ہے۔ طوطی کو تیر مارنا ''خلق'' سے تعلق منقطع کرنے کا اشارہ بھی ہے۔ طوطی کے مرتے ہی طلسم ٹوٹ جاتا ہے اور طلسم کائنات کا رمز ہے گویا فانی کائنات کی اصلیت کا علم ہو گیا۔ تیسری مرتبہ نشانہ لگانے سے پہلے حاتم خود کو خدا کی رضا پر چھوڑ دیتا ہے۔ صوفیا نے ''مقام فنا'' کو ''مقام رضا'' بھی کہا ہے کیونکہ آخری فتح اسی حوالے سے حاصل ہوتی ہے۔[۲۵]

حاتم کے سات اسفار میں اس کی مہمات کے تمام مراحل علامتی سطح پر بھرپور معنویت آشکار کرتے ہیں۔ سہیل احمد خان نے اِس ضمن میں حاتم کے سفر کی بعض بنیادی علامتوں کو محض تصوّف کے آئینے میں رکھ کر دیکھا ہے۔ تاہم اس کی دیگر توجیہات بھی ممکن ہیں اور ان کی طرف انھوں نے اشارہ بھی دیا ہے مثلاً نفسیات کے حوالے سے وہ میری لوئز وون فرانز کے مضمون کا ذکر کرتے ہیں جس میں وہ کہتی ہیں کہ چڑھتا پانی لاشعور کے خطرات کی علامت ہے اور وہ طوطی جسے حاتم تیر مارتا ہے ''نقل'' کے تصوّر سے وابستہ ہے۔ فردیت کے حصول میں کسی کی نقل نشانہ خطا کر دیتی ہے۔ سہیل احمد خان نے بعض علامتوں کی جو تشریحات کی ہیں اُن میں کمی بیشی کا بھی امکان ہوسکتا ہے۔ علامت کے ساتھ زمان و مکان کا تصور بھی وابستہ ہے۔ جس زمانے یا مقام پر وہ علامت استعمال کی گئی اس کی تشریح بھی اسی تناظر ہی میں ممکن ہے۔ سہیل احمد خان اِس صورت حال سے پوری طرح باخبر ہیں۔ انھوں نے اس بات کا بھی ادراک کیا کہ علامتوں کے جہان میں قدم رکھتے ہوئے کیا کیا خطرات درپیش ہیں :

''قدیم علامتوں پر غور کرنے والوں کے سامنے یہ سوال بار بار آیا ہے کہ ان علامتوں کی ''تاریخ'' کیا ہے۔ اس سوال کا جواب مختلف علوم کے نمائندوں نے اپنے اپنے طریقے سے دیا ہے اور اکثر لوگوں نے بعض بنیادی حقائق سے انحراف کر کے ٹھوکریں کھائی ہیں۔''[۲۶]

بہت سی علامتوں کا تعلق کسی خاص تاریخی لمحے سے ہوتا ہے اور ان کی معنویت اس خاص تاریخی لمحے کے حوالے ہی سے آشکار ہوتی ہے۔ اِسی طرح بے شمار ایسی علامتیں موجود ہیں جن کا تعلق معاشرت یا تاریخ کے کسی خاص لمحے سے نہیں بلکہ ان کی ساخت آفاقی ہوتی ہے۔ بعض اوقات کسی چیز کو ہم اپنے تاریخی اور تحقیقی تجزیے کی رُو سے کوئی نئی علامت سمجھ رہے ہوتے ہیں لیکن حقیقت میں وہ کسی قدیم علامت ہی کی ایک شکل ہوتی ہے۔ نفسیات دانوں کے نزدیک علامت کی تاریخ سے زیادہ اس کی معنویت زیادہ اہم قرار پاتی ہے۔ اس صورت حال میں بعض موقعوں پر محض تاریخی یا تحقیقی طریقہ نامکمل ٹھہرتا ہے۔ چناں چہ علامتوں پر غور کرتے ہوئے بعض اوقات یہ سارا عمل انتہائی پیچیدہ ہو جاتا ہے جس کی عقدہ کشائی کے لیے کئی جہتوں سے آگے بڑھنا پڑتا ہے۔ اِسی لیے سہیل احمد خان نے اسے ایک طویل سفر کا آغاز کہا ہے۔ جس کے لیے ان کی زندگی ناکافی ثابت ہوئی۔ وہ تو رخصت ہوئے مگر بقول انتظار حسین : (انھوں نے جو چراغ جلایا) ''اس کی روشنی بھی دُور تک اور دیر تک رستہ دکھاتی رہے گی۔'' ۲۷

بَلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے
فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم

حوالہ جات:

۱۔ انتظار حسین، فلیپ پسِ سرِ ورق، مجموعہ سہیل احمد خان، لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۹ء
۲۔ سہیل احمد خان، سیر بین، مجموعہ سہیل احمد خان، ص: ۴۹۳
۳۔ ایضاً، ص: ۴۹۳
۴۔ ایضاً، ص: ۴۹۳
۵۔ احمد جاوید، ڈاکٹر سجاد باقر رضوی : چند یادیں، مضمون مشمولہ : خوشبو تیری یادیں، مرتبہ، عاصمہ اصغر، لاہور: یونیورسٹی آف ایجوکیشن، ۲۰۰۹ء، ص: ۴۱
۶۔ تبسم کاشمیری، ڈاکٹر، باقر صاحب کی یاد میں، مضمون مشمولہ: خوشبو تیری یادیں، ص: ۱۳۔۱۴
۷۔ ایضاً، ص: ۱۴
۸۔ مظفر علی سیّد کی علمیّت اور وسعت مطالعہ کا اعتراف انتظار حسین، غالب احمد اور بعض دیگر اہلِ علم نے بھی کیا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر خالد سنجرانی کا ایک نہایت عمدہ مضمون ''مظفر علی سیّد کے دوہے، گیت اور بھجن'' کے عنوان سے بہاؤالدین زکریا یونیورسٹی کے مجلّہ ''جرنل آف ریسرچ'' ۲۰۰۶ء، میں شائع ہوا جس سے اُن کی کئی علمی جہتیں نمایاں ہوتی ہیں۔
۹۔ سہیل احمد خان، سیر بین، مجموعہ سہیل احمد خان، ص: ۴۹۳
۱۰۔ ایضاً، ص: ۴۹۴
۱۱۔ ایضاً، ص: ۴۹۷

۱۲۔ ایضاً، ص: ۴۹۶

۱۳۔ سہیل احمد خان، علامتوں کے سرچشمے، مجموعہ سہیل احمد خان، ص: ۱۱

۱۴۔ ایضاً، ص: ۱۱

۱۵۔ ایضاً، ص: ۱۶

۱۶۔ ایضاً، ص: ۱۷

۱۷۔ ایضاً، ص: ۱۸

۱۸۔ ایضاً، ص: ۲۹

۱۹۔ سہیل احمد خان، داستانوں کی علامتی کائنات، مجموعہ سہیل احمد خان، ص: ۱۵۸

۲۰۔ ایضاً، ص: ۱۶۰

۲۱۔ ایضاً، ص: ۱۶۱

۲۲۔ ایضاً، ص: ۱۶۱

۲۳۔ ایضاً، ص: ۱۶۲

۲۴۔ ایضاً، ص: ۱۶۳

۲۵۔ ایضاً، ص: ۱۶۳۔۱۶۴

۲۶۔ سہیل احمد خان، علامتوں کے سرچشمے، مجموعہ سہیل احمد خان، ص: ۲۶

۲۷۔ انتظار حسین، فلیپ پس سرِ ورق، مجموعہ سہیل احمد خان